غامدی صاحب: دبستان شبلی کے وارث یا دبستان سرسید کے جانشین

غامدی صاحب کے حلقۂ فکر کا علمی اثاثہ صرف گنے چُنے موضوعات کیوں؟

غامدی صاحب ایک مضمون میں لکھتے ہیں: ''شبلی ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے ہنگامۂ مغرب میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ یہ انہی کا دور ہے جس میں مغربی تہذیب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا اور اس کے نتیجے میں یہ امّت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول و مبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اس کے علوم اس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھہریں۔ یہ دیوبند کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک حق و باطل کا معیار یہی تہذیب اور اس کے علوم قرار پائے۔ ان کا سرخیل وہی بڈّھا [سرسیّد احمد خان] تھا جس کے بارے میں خود شبلی نے کہا تھا ؎ پیری سے کمر میں اک ذرا خم۔ شبلی ان دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت کے بانی ہوئے۔ اس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے: ایک یہ کہ ہمارے لیے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں۔ دوسرے یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اسی طرح آشنا رہیں جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ میں اسے ''دبستان شبلی'' کہتا ہوں۔ اس دبستان میں جس شخص کو امام العصر کہنا چاہیے وہ تنہا حمید الدین فراہی ہیں۔ چنانچہ اس راہ کے مسافروں میں منزل بھی تنہا اسے ہی ملی۔ اب اس وقت دیکھیے، پہلے گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ دوسرا گروہ پرانی ضلالتوں کی کچھ عرصے کے بعد مٹ جائے گا۔ آنے والے دور کی امامت ''دبستان شبلی'' ہی کے لیے مقدر ہے۔'' اس لفاظی کے بعد غامدی صاحب خود کو دبستان شبلی کی مسند کا واحد اور آخری جانشین سمجھتے ہوئے بزعم خود مسند نشین ہو جاتے ہیں اس دبستان کے سرخیل حمید الدین فراہی کی شخصیت اور افکار کا ابھی تک سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ عموماً ان کی شہرت ۱۹۳۰ء میں معارف میں سلیمان ندویؒ کے معرکہ آراء شذرے سے عام ہوئی کیونکہ ان کی تحریریں جان بوجھ کر شائع نہیں کی گئیں سلیمان ندویؒ فراہی صاحب کے بارے میں اس وقت شدید تحفظات کا شکار ہوگئے تھے جب ان کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں دارالمصنفین طباعت کے لیے آئیں لیکن ان کی طباعت سے انکار کر دیا گیا۔ دبستان شبلی کے بانی حمید الدین فراہی کی زندگی کو بھی از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے: ۱۹۰۰ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے عرب سرداروں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے سواحل عرب اور خلیج فارس کا خفیہ سفر کیا اس سفر میں ترجمانی کے لئے حمید الدین فراہی کا انتخاب کیا گیا یہ انتخاب کس کے کہنے پر ہوا تھا یہ ایک الگ داستان ہے اسی سفر سے واپسی پر علی گڑھ میں انھیں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ حیدر آباد دکن میں دارالعلوم میں تدریس کی نوکری دی گئی، جو وہاں کا سب سے بڑا سرکاری مدرسہ تھا الہ آباد یونیورسٹی سے عربی کی پروفیسری چھوڑ کر اسکول کی نوکری کیوں قبول کی گئی؟ یہ وہی حیدر آباد تھا جہاں علامہ اقبال عدالت کا جج بن کر جانا چاہتے تھے، کشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد، سر اکبر حیدری اقبال سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود اقبال کو مغرب کے خلاف شاعری کے جرم کی پاداش میں حیدر آباد کی ملازمت نہیں مل سکی۔ لیکن حمید الدین فراہی کو بغیر خواہش کے یہ ملازمت دے دی گئی اور یونیورسٹی کی پروفیسر شپ پر ایک اسکول کی مدرسی انھوں نے بخوشی قبول کر لی جبکہ مالی طور پر وہ آسودہ شخص تھے ضرورت مند نہ تھے۔ اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ فراہی صاحب کو اپنے عہد کے وائسرائے کرزن کے ایک خفیہ سفر میں کرزن کی ترجمانی کا شرف بخشا گیا تھا۔ عصر حاضر کے لارڈ کرزن نے غامدی صاحب کو مغرب اور اسلام کی ترجمانی کے لیے

کیوں منتخب کیا ہے؟ یہ محض اتفاق ہے یا حادثہ؟ اس سوال کے جواب سے بے شمار عقدے حل ہو جائیں گے۔ اصلاً غامدی صاحب دبستان سرسیّد کے حقیقی، روحانی، معنوی اور اصلی جانشین ہیں جو قرآن کو کلام اللہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ غامدی صاحب ابھی اس مقام تک نہیں پہنچے سرسید کی طرح ان کی شخصیت مکمل ارتقاء یافتہ نہیں ہوسکی ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے جو جلد پوری ہو جائے گی۔ لیکن برعظیم کی اسلامی تاریخ میں علامہ اقبال کے بعد وہ دوسرے آدمی ہیں جس نے سنت کا بحیثیت ماخذ دین علماً وعملاً انکار فرمادیا ہے اور سنت کو رسول اللہ سے خاص کرنے کے بجائے اسے حضرت ابراہیمؑ اور تمام انبیاء سابقین سے مختص کر دیا ہے۔ یہ ارتقاء کا پہلا زینہ ہے دوسرا زینہ سرسید کے تتبع میں قرآن کے کلام اللہ سے انکار پر منتج ہوگا۔ سنت کو ماخذ دین کے طور پر منہدم کرنے کے لیے غامدی صاحب نے ۱۹۷۸ء سے لے کر ۲۰۰۷ء تک سنت کے تقریباً چودہ مختلف اور متضاد مفاہیم بیان کیے ہیں اور ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ ہر مفہوم کے ساتھ لاریب کا صیغہ بھی استعمال فرماتے ہیں۔ ان کے خیال میں ''محمدؐ سے دین ہمیں تین صورتوں میں ملا ہے۔ قرآن مجید، سنت ثانیہ، حدیث۔ ہمارا دین رسول کی ذات ہی سے وابستہ ہے ان کے اوامر و نواہی تقاریر و گفتگوئیں نصیحتیں اور تادیبات اعمال اور فیصلے یہاں تک کہ کسی معاملے میں ان کی خاموشی بھی اسے دین کا حصہ بنا دیتی ہے لہٰذا لاریب ہم بلا تامل یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ دین کا ماخذ تنہا رسول اللہ کی ذات ہے ان سے دین ہم تک قرآن کے الفاظ سے آتا ہے یا اس کے مطابق ان کے عمل سے یہی چیز ہے جسے ہم سنت کہتے ہیں'' کتاب وسنت ایک حقیقت کے دو روپ ہیں جو کچھ دین ہے وہ کتاب وسنت ہی سے ماخوذ ہے۔ دین کے ماخذ قرآن وسنت ہیں جب کہ اسلامی قانون کے ماخذ قرآن سنت اور اجتہاد ہیں۔ کیوں کہ امام اصلاحی قیاس اجماع کو اجتہاد کی دو قسمیں بتاتے ہیں] دین کا ماخذ صرف قرآن نہیں بلکہ رسول اللہ بھی ہیں، دین پیغمبر کے قول فعل تقریر و تصویب کا نام ہے۔ اللہ کے رسول نے دین کو جاننے کے لئے تین چیزیں چھوڑی ہیں قرآن سنت حدیث ان تینوں ذرائع سے جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو دین کا جزو بنتی ہے۔ قرآن مجید دین کا ایک حصہ ہے سارا دین نہیں حدیث قرآن وسنت کے کسی حکم کی تشریح کرتی ہے۔ جمہوریت ایک باطل نظام ہے اس کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اس موضوع پر غامدی صاحب نے اشراق جون ۸۹ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

ایک زمانے میں عورت کی ختنہ، ایام حیض میں عورت کے روزوں کی قضاء سُنت سے ثابت تھی، سنت کی روشنی میں حائضہ عورت مسجد نہیں جاسکتی تھی چور کا ہمیشہ دایاں ہاتھ کاٹنا سنت تھا، ارتقاء کے اس سفر کے دوران ایک تقریر میں فرماتے تھے، قرآن مجید دین کا ایک حصہ ہے سارا دین نہیں۔ حدود میں قتل سرقہ زنا قذف کی سزاؤں کا غیر مسلم رعایا پر بھی یکساں اطلاق سُنت سے ثابت تھا۔ انھیں اسلامی انقلاب کے نبوی منہاج کی پوری تاریخ اور مراحل قرآن مجید حدیث وسنت کے ذخائر میں محفوظ نظر آتی تھی ان کی نظر میں اس وقت جمہوریت ایک باطل نظام تھا جس کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ جماعت اسلامی کو جمہوری عمل میں شرکت پر غامدی صاحب نہایت جلی کٹی سناتے تھے لیکن اچانک تاریخ رک گئی زمین و آسمان کی نبضیں تھم گئیں اور غامدی صاحب کے خیالات ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملے کے بعد بالکل ہی بدل گئے۔

جاوید غامدی صاحب کو اس بات کا زعم ہے کہ دبستان شبلی مشرق ومغرب کا جامع ہے اور عالم اسلام میں یہ واحد دبستان ہے جو جدید و قدیم علوم سے واقف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال محض دعویٰ ہے۔ حمید الدین فراہی جدید مغربی فکر وفلسفے اور جدید سائنس وٹیکنالوجی کے مباحث سے قطعاً ناواقف تھے۔ اصلاحی صاحب کا دعویٰ تھا کہ اس موضوع پر انھوں نے مسودہ تحریر فرمایا تھا لیکن شاید وہ اس قابل نہ تھا کہ اہل علم اس سے استفادہ کر سکتے۔ سو سال گزر جانے کے باوجود اہل علم اس مسودے سے لاعلم ہیں۔ خود غامدی صاحب بھی اس سے مستفید نہ ہوسکے۔ یہی حال امین احسن اصلاحی کا تھا۔ وہ بھی جدید مغربی فکر وفلسفے کے مباحث سے یکسر ناواقف رہے اور کبھی ان علوم کی تحصیل نہیں کی قدیم علوم میں امت کے تعامل اور صحابہ کبار کے نظائر کو ترک کر کے اپنے استاد فراہی صاحب کی آزادانہ پیروی پر فخر کرتے رہے۔ جاوید غامدی صاحب قدیم علوم میں فراہی صاحب اور اصلاحی صاحب جتنی استعداد بھی نہیں رکھتے، ان کو زعم ہے کہ وہ لغت عرب اور ادب جاہلیت کے واحد سوداگر ہیں لیکن ان کی عربی دانی کا حال یہ ہے کہ وہ عربی زبان میں ایک درست جملہ لکھنے سے قاصر ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں غامدی صاحب نے پہلی مرتبہ عربی زبان میں کل ایک سو بائیس صفحات لکھے اور صرف ۲۲ صفحات الاعلام کے چار شماروں میں شائع کیے ان مضامین کی عربی املا، انشاء، زبان، بیان، صرف ونحو، مطالب مفاہیم ہر اعتبار سے اغلاط کا دفتر ہے۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ۱۹۸۲ء کی یہ غلط درغلط بلکہ غلط سلط تحریریں آج بھی المورد کی ویب سائٹ [۵/اپریل ۲۰۰۷ء تک] پر موجود ہیں جس میں ۱۹۸۲ء کی تمام اغلاط من وعن درج ہیں۔ جاوید غامدی صاحب آج بھی اپنی ۲۷ سال قدیم اور غلط عربی تحریر کی تصحیح کی صلاحیت سے عاجز وقاصر ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ تحریر بھی ان کی نہیں ہے کسی اور سے لکھوائی گئی ہے۔ ورنہ ارتقاء کے اصول کے تحت ہر شخص اپنی ۲۷ سالہ پرانی تحریروں کی تصحیح وترمیم بخوبی کر سکتا ہے۔ [بقیہ سرورق کے اندرونی حصے پر]